بحث ونظر

سورۃ العصر کی تفسیر میں چند گذارشات

جناب امیر نواز صاحب مدرس۔ جامعہ عربیہ مجی ٹی روڈ گوجرانوالہ

(۱)

میں نے ترجمان القرآن مئی ۱۹۸۷ء کے شمارے میں پروفیسر آسی ضیائی صاحب کا مضمون — ایک سورۃ کی تفسیر پر کچھ "معروضات" — ملاحظہ کیں جن میں پروفیسر صاحب نے خلاصتہً یہ اشکال وارد کیا ہے کہ سورۃ العصر کی تفسیر جو مفسرین نے کی وہ دُنیا کے حالات پر منطبق نہیں ہوتی، کیوں کہ اس تفسیر کا منشا یہ ہے کہ: زمانہ اس بات پر گواہ ہے کہ انسان خسارے میں ہے سوائے ان لوگوں کے جو ایمان لائے اور نیک عمل کیے، اور حق وصبر کی وصیت کی۔

اب جس وقت ہم اس سورۃ کی اس تفسیر کو دُنیا کے حالات پر منطبق کرتے ہیں تو ہمارے سامنے جو حالات آتے ہیں وہ یہ ہیں کہ غیر مسلم اقوام بھی مادی نفع اُٹھا رہی ہیں، بلکہ مسلمانوں سے کہیں زیادہ ترقی یافتہ اور خوشحال ہیں، تو وہ کیسے خسارے میں ہیں، اور دوسری طرف ایک آدمی اگر اسلام قبول کر لیتا ہے تو اس پر بسا اوقات مصائب ومشکلات پہلے کی نسبت زیادہ ہو جاتی ہیں، تو ایمان والے کیسے خسارے سے بچ نکلے؟ بلکہ ظاہراً تو وہ خسارے میں ہیں اور کفار خسارے سے بچے ہوئے ہیں۔

اس کا حل پروفیسر صاحب نے یہ نکالا ہے کہ سورۃ عصر میں " وَالْعَصْرِ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ " الگ کلام ہے، جس کا سورۃ کے باقی حصہ سے کوئی تعلق نہیں — یعنی اس حصہ میں یہ بتایا گیا ہے کہ تمام انسان خسارے میں ہیں۔ یعنی موت، فوت سے نہیں بچ سکتے، فنا ہو کر رہیں گے

زمانہ اس پر گواہ ہے۔

اور باقی سورہ کا اس سے استثنیٰ صحیح نہیں۔ بلکہ باقی سورۃ الگ ایمان والوں کے لیے بشارت ہے، اس کا زمانہ کی گواہی سے کوئی تعلق نہیں۔

ہماری گذارش یہ ہے کہ تفسیر وہی صحیح ہے جو تمام مفسرین نے کی ہے کہ زمانہ اس پر گواہ ہے کہ تمام لوگ خسارے میں ہیں سوائے ان لوگوں کے جو ایمان لائے اور جنہوں نے اعمالِ صالحہ کیے اور جو تواصی بالحق اور تواصی بالصبر کے اصول پر قائم رہے۔

اور پروفیسر صاحب نے جو خیال ظاہر فرمایا ہے وہ اس سورۃ کے مفہوم کو نہ سمجھنے کی وجہ سے پیدا ہوا ہے۔

اسے اس طرح سمجھنے کی کوشش کی جائے کہ یہ سورہ تذکیر بایام اللہ کے قبیل سے ہے، یعنی ان تاریخی حالات و واقعات کے قبیل سے ہے جو قرآنِ کریم میں اس غرض کے لیے بیان ہوئے ہیں کہ اہلِ ایمان کے لیے باعثِ تسکین ہوں اور کفار کے لیے تہدید، یعنی زمانہ کی گواہی سابقہ تاریخ سے متعلق ہے اور آئندہ کے لیے تنبیہ بھی ہے۔

مطلب یہ ہے کہ اے قرآن کے مخاطبین! زمانہ کی گردش اس بات پر گواہ ہے کہ سب لوگ خسارے میں ہیں — سوائے اُن خوش نصیبوں کے جنہوں نے مانا، اطاعت کی اور اپنی روش کو بہتر بنایا۔ خود حق کا ساتھ دیا اور دوسروں کو بھی حق کا ساتھ دینے کی وصیت کی، پھر حق کے لیے جو مصائب و مشکلات پیش آئیں، اُن کو جرأت مندی اور حوصلہ سے برداشت کیا اور دوسروں کو بھی صبر کی تلقین کی۔ (یہ لوگ ہیں جو خسارے سے بچ نکلے ہیں)

اس کے برعکس جنہوں نے اللہ کے رسولوں کی دعوتِ حق کا انکار کیا اور اپنی بداعمالیوں میں مشغول رہے وہ تباہ و برباد ہوئے اور خسارے میں رہے۔ تو تم بھی اے قرآن کے مخاطبین زمانے کی اس گواہی سے سبق حاصل کرو اور رسول اللہ کی دعوتِ حقہ کو قبول کرو، ورنہ تمہارا انجام بھی ویسا ہی ہوگا جیسا کہ تم سے پہلے لوگوں کا ہو چکا ہے۔

اسی تفسیر کی روشنی میں اب ان واقعات و قصص پر نگاہ ڈال لی جائے جو قرآن میں تذکیر و تبشیر کے عنوان سے بیان ہوئے ہیں۔ مثلاً نوح علیہ السلام اور ان کی قوم، ہود علیہ السلام اور اُن کی

قوم، صالح علیہ السلام اور ان کی قوم، لوط علیہ السلام اور اُن کی قوم، شعیب علیہ السلام اور اُن کی قوم، معرکۂ نمرود و خلیل علیہ السلام۔ معرکۂ فرعون و کلیم علیہ السلام۔

اور اگر دولت و اقتدار کو خسارے سے بچاؤ سمجھا جائے تو نمرود و فرعون کا اقتدار، قارون و ہامان کی دولت اور قریش کی سرداری بھی ملاحظہ فرمائیں۔

باقی جو تفسیر پروفیسر صاحب نے پیش فرمائی ہے کہ "والعصر ان الانسان لفی خسر" اور "الا الذین آمنوا" الخ بالکل بے وجود ہیں —— اس سے قرآن کی ادبی حیثیت مجروح ہوتی ہے۔ اور قرآن کریم وہ کتاب ہے جس نے دنیا بھر کے مخالفوں کو ادب کی بنا پر چیلنج دیا ہے۔

---

(۲)

سورہ "العصر" کے سلسلے میں آخری گذارش

جناب آسی ضیائی صاحب

مئی کے ترجمان القرآن میں سورۃ العصر پر میری گذارشات کے جواب میں اگلے ہی ماہ دو فاضل حضرات نے جو کچھ فرمایا، اس پر میں ان کا ممنون ہوں۔ میں نے اُن کا بغور مطالعہ کیا اور میں تسلیم کرتا ہوں کہ اس سے میرے موقف میں کسی قدر تبدیلی آئی ہے۔ مگر اس تبدیلی نے میرے نقطۂ نظر کو اور بھی مستحکم کر دیا ہے۔ اس سلسلے میں یہ پھر عرض کر دوں کہ سابق مضمون میں بھی میں نے اہلِ علم سے ایک طالب علمانہ استفسار کیا تھا۔ اور اب بھی اس سے زیادہ میرا کوئی مقصد نہیں، البتہ اگر میری موجودہ معروضات کے جواب میں کچھ لکھا گیا اور اس سے میری تشفی نہ ہو سکی تب بھی میں اس موضوع کو مزید طول نہیں دوں گا۔ کیونکہ مناظرہ بازی میرے ذوق کے بھی خلاف ہے اور خود "ترجمان القرآن" کے بھی شایاں نہیں۔

میرا موجودہ تبدیل شدہ موقف یہ ہے کہ زمانہ جس بڑے خسارے پر گواہ ہے وہ موت نہیں، خود گزرتا ہوا زمانہ ہے، جو ہر آن مستقبل سے حال میں آتا ہوا ماضی بن رہا ہے، اور جو ایک بار نکل جائے تو ہرگز ہاتھ نہیں آتا، اور جس کے بھرپور استعمال کے باوجود، اس کے گزر جانے

کے بعد ہر شخص کو اس سے خاطر خواہ فائدہ نہ اُٹھا سکنے کا قلق رہتا ہے۔ یہ ایک ایسی نفسیاتی حقیقت ہے جس سے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔ ایک دنیادار عیاش، ایک کامیاب کاروباری، ایک مقبول شاعر، ایک عظیم فاتح، غرض ہر شخص اپنے گزرے ہوئے زمانہ کو حسرت ہی کے ساتھ یاد کرتا ہے، اور اس کے "ضائع جانے" پر کفِ افسوس ملتا ہے۔ حد یہ ہے کہ اگر ایک شخص کی ساری زندگی عبادتِ الٰہی میں گزری ہو، وہ بھی گزرے ہوئے زمانہ کے "خسارے" کا غم دل میں رکھتا ہے۔ اس نفسیاتی نکتے کو غالبؔ نے بڑی خوبصورتی سے یوں کہا ہے ؎

ٹلتا ہے فوتِ فرصتِ ہستی کا غم کوئی
عمرِ عزیز، صرفِ عبادت ہی کیوں نہ ہو

یہی انسان کا وہ خسارہ ہے جس پر العصر گواہ ہے، اور ظاہر ہے کہ یہ گواہی آپ سے آپ اس استثناء سے باہر ہی باہر رہتی ہے، کیونکہ العصر کے خسارے کا احساس تو، جیسا اُوپر عرض کیا گیا ہے، اہلِ ایمان کو بھی رہتا ہے، اور اس سے جلیل القدر صحابہؓ تک مستثنیٰ نہیں ہیں۔ ہر بزرگ اپنے اخیر وقت میں یہی کہتا اور پچھتاتا سُنا گیا ہے کہ اُس نے آخرت کے لیے کچھ نہیں کیا[1]۔ (مثالیں دینے کی ضرورت نہیں) بلکہ میرے خیال میں تو جو جتنا بڑے درجے کا ایمان و عملِ صالح وغیرہ کا سرمایہ رکھتا ہے وہ اتنا ہی ماضی پر متاسف اور مستقبل کی طرف سے فکرمند ہوتا ہے۔ اور یہ ذوقِ ایمان ہی کا نتیجہ ہوتا ہے۔ اس کے برخلاف اگر وہ مطمئن ہو کہ اس نے آخرت کے لیے جو کچھ سرمایہ جمع کر لیا ہے وہ کافی ہے تو اُسے اپنے ایمان کی خیر منانی چاہیے۔ اسی "فوتِ فرصتِ ہستی" کے غم کو غالبؔ نے مزید خوبصورتی کے ساتھ یوں کہا ہے:

بے صرفہ ہی گزرتی ہے، ہو گرچہ عمرِ خضر
حضرت بھی کل کہیں گے کہ ہم کیا کیا کیے

---

[1] اور اس کی طرف قرآن نے بھی جا بجا اشارہ کیا ہے کہ بامراد اہلِ ایمان وہی ہیں جو "خشیت رب" سے کانپتے رہتے ہیں اور اسے "خوف اور طمع" کے ساتھ یاد کرتے ہیں۔ اب ظاہر ہے کہ اس خوف و خشیت کی بنیاد وہی "فوتِ فرصتِ ہستی کا غم" ہی ہو سکتا ہے۔

پس نتیجہ یہ نکلا کہ اگرچہ زمانہ ہر آن انسان کے خسارے میں ہونے کی گواہی دے رہا ہے، مگر اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے کہ اس خسران کی تلافی آخرت میں کر دی جائے گی، بشرطیکہ وہ ان چار صفات سے آراستہ ہوں (یعنی ایمان، عمل صالح، تواصی بالحق اور تواصی بالصبر)

رہا جناب نورالٰہی کا یہ کہنا کہ "اللہ تعالیٰ کے نزدیک حقیقی خسارہ آخرت کا خسارہ ہے"۔ تو اس سے میں یا کوئی اور انکار کر کے مومن ہی کب رہ سکتا ہے؟ مگر اس حقیقی خسارے کی تلافی پر العصر کس طرح گواہ بن سکتا ہے ـــــ یہی میرا اصل سوال ہے۔ آج تک نہ تو زمانے نے یہ دیکھا کہ کافر کی موت پر آسمان سے ندا آئی ہو کہ یہ ابدی خسارے میں جا پڑا! اور نہ مومن صالح کی موت پر لوگوں نے فرشتے اترتے اور اس کی روح کو مبارکباد دیتے دیکھے کہ زمانہ اس پر گواہ بن سکے۔ اگر زمانہ اس ابدی خسران و فلاح پر گواہ ہوتا تو وہ کونسا کافر ہے جو ایمان نہ لے آتا؟ یہ سب امور انسان سے غیب میں رکھے گئے ہیں۔ اور اس سے اسی ایمان بالغیب کا مطالبہ کیا گیا ہے، جس کا صلہ ابدی فلاح عطا کیے جانے کی ضمانت دی گئی ہے۔

نورالٰہی صاحب نے مولانا فراہی کی تفسیر کا جو حوالہ دیا ہے وہ بھی میرے سوال کا جواب نہیں۔ ان کا فرمانا ہے کہ پچھلی قوموں نے "اگر نیکیاں کیں بھلائیاں کیں تو خدا نے ان کو عروج و کمال بخشا۔ اگر انہوں نے ظلم و فساد کی راہ اختیار کی تو قانونِ الٰہی نے انہیں تباہ و برباد کر دیا"۔ مگر مولانا نے سورہ کے استثناء کا سب سے پہلا اور سب سے اہم جزء "ایمان" نظر انداز کر دیا ہے۔ اور ایسا شاید انہوں نے قصداً کیا۔ کیونکہ ایمان نہ لانے والی قوموں نے بھی بعض بنیادی بھلائیاں اختیار کر کے دنیا میں عروج حاصل کیا ہے۔ اور جب وہ ان بھلائیوں سے تہی دامن ہو گئیں تو تباہی بلکہ فنا کے غار میں جا پڑیں۔ اس معاملے میں مومن و غیر مومن کی کوئی تخصیص نہیں ہے۔ قدیم بابلی، مصری، چینی، یونانی، رومن، سبائی اور دیگر قومیں، جن کے عروج کی داستانیں تاریخ کا حصہ بن چکی ہیں۔ ایمان نہ لانے کے باوجود دنیا میں خوب پھولیں پھلیں۔ اور قریب کے زمانے میں یورپی اقوام، امریکہ اور روس وغیرہ کی مثالیں ہمارے سامنے ہیں۔ پھر خود ہی سوچیے کہ زمانہ صرف اہلِ ایمان کو اس خسارے سے محفوظ رہنے کی گواہی کس طرح دے سکتا ہے۔

اسی طرح شاہ عبدالعزیز صاحب کی تفسیر کا اقتباس بھی دعوے کی تردید نہیں کرتا۔ اگر

ایک کافر نے حضرت صدیق اکبرؓ سے یہ کہا کہ تم نے باپ دادا کا دین ترک کر کے لات و عزّیٰ کی عبادت چھوڑ کر اور ان دیویوں کی شفاعت سے ناامید ہو کر زیاں کاری کی ہے تو اس کا جواب حضرت صدیقؓ نے وہی دیا جو ایک سچا اور پکا مومن دے سکتا ہے کہ حق کو قبول کرنے والا خائب و خاسر نہیں رہ سکتا ۔ یہ پُراعتماد جواب اللہ کے وعدے پر بھروسہ کر کے انھوں نے دیا ، نہ کہ زمانے کو گواہ بنا کر ۔ اور اس کی تائید میں اللہ تعالیٰ نے زمانے کی گواہی کے علاوہ اپنا وعدہ پھر دہرا دیا ۔

جناب نورالٰہی نے میرے اس دعوے کی بھی تردید کی ہے کہ آخرت میں العصر کا وجود نہیں ہوگا ۔ یہ اگرچہ ایک غیر متعلق بحث ہے ، مگر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس کی بھی وضاحت کر دی جائے ۔ موصوف نے جواب میں ایک فروگذاشت تو یہ کی ہے کہ " العصر " اور " الدہر " کو ہم معنی سمجھ کر سورۂ " دہر " کی پہلی آیت سے استدلال کیا ہے ۔ حالانکہ " العصر " کا صحیح مفہوم وہ زمانۂ گزراں ہے کہ جو ماضی ، حال اور مستقبل پر منقسم ہوتا ہے ، جب کہ " الدہر " اس کیفیت کا نام ہے جسے موجودہ اصطلاحِ فلسفہ میں " دورانِ خالص " (PURE DURATION) کہا جاتا ہے ۔ بہرحال خواہ العصر ہو یا الدہر ، دونوں ہی اللہ تعالیٰ کی مخلوق ہیں ۔ زمانے کو ازلی اَبدی سمجھنا قدیم ملحد یونانیوں کا فلسفہ تھا ، جس کی تردید حکماء اسلام نے کی ہے ، اور موجودہ صدی میں تو اس کا تصور ہی بدل چکا ہے ۔ اب تو " زماں " بھی طول ، عرض اور عمق کی طرح " مکان " کی بُعدِ رابع (FOURTH DIMENSION) تسلیم کر لیا گیا ہے ۔ یعنی " مکاں " کے ساتھ ہی " زماں " بھی قائم ہے ۔ اور اگر کوئی مقام (اگر اسے " مقام " کہا جا سکے) " لامکان " بھی ہے جس کا ذکر اسلامی ادبیات میں بارہا آیا ، اور آتا رہتا ہے تو ظاہر ہے کہ وہاں " لا زماں " بھی ہوگا ۔

اس کے علاوہ زماں کا تصور اضافی بھی ہے اور اس امر کو بھی اب تسلیم کیا جا چکا ہے ۔ انسانوں نے اسے اپنی سہولت کے لیے اسے سالوں ، مہینوں ، گھنٹوں اور منٹوں وغیرہ میں تقسیم کر لیا ہے ، ورنہ اس کی لمبائی یا اختصار کا تعلق بڑی حد تک ذہنِ انسانی کی مختلف اور بدلتی ہوئی کیفیات سے ہے ، مثلاً بقول اقبال ؎

مہینے وصل کے گھڑیوں کی صورت اڑتے جاتے ہیں　　مگر گھڑیاں جدائی کی گزرتی ہیں مہینوں میں

بلکہ جوں جوں اقبال کا مطالعہ وسیع و عمیق ہوتا گیا، انہوں نے اس حقیقت کو فلسفیانہ طور پر بھی پیش کیا۔ اپنی نظم "نوائے وقت" میں زمانے کی زبانی وہ انسان سے کہتے ہیں:

ع در من نگری ہیچم، در خود نگری، جانم

اور ع از جانِ تو پیدایم، در جانِ تو پنہانم

اور "مسجد قرطبہ" میں ارشاد ہوتا ہے۔

؎ تیرے شب و روز کی اور حقیقت ہے کیا
ایک زمانے کی رو جس میں نہ دن ہے نہ رات

پھر زیادہ کھل کر "لینن کی زبان سے خدا کے حضور عرض کرتے ہیں۔

؎ ہم بندِ شب و روز میں جکڑے ہوئے بندے
تو خالقِ اعصار و نگارندۂ آنات

گویا میں نے اگر آخرت میں "العصر" کا ہونے سے انکار کیا تو یہ میری کوئی اپج نہیں تھی۔ دوسری فروگذاشت جناب نورالٰہی صاحب سے یہ ہوئی کہ زمانے کے وجود کو اس دنیا سے قبل اور مابعد ثابت کرنے کے لیے جن آیات کا حوالہ دیا ہے وہ متشابہات کی قبیل سے ہیں، مگر انہوں نے ان کے لغوی معنی ہی لے لیے ہیں: مثلاً یہ کہ اللہ تعالیٰ نے یہ کائنات چھ دن میں بنائی، یا قیامت کا دن انسانی حساب سے پچاس ہزار سال کے برابر ہوگا، وغیرہ۔ حالانکہ ان سے مقصود فقط ذہنِ انسانی کو ذاتِ باری تعالیٰ کی عظمت اور قدرت کا تصور دلانا اور اس عملِ خداوندی کی اہمیت جتانا ہے۔

ورنہ اگر متشابہات کو بھی اُن کے لُغوی معنوں میں لیا جائے تو اللہ تعالیٰ کا "نفس" (تَعْلَمُ مَا فِیْ نَفْسِیْ وَلَا اَعْلَمُ مَا فِیْ نَفْسِكَ) "دو ہاتھ" (بَلْ یَدٰهُ مَبْسُوْطَتٰنِ) "کئی آنکھیں" (وَاصْنَعِ الْفُلْكَ بِاَعْیُنِنَا) "چہرہ" (كُلُّ شَیْءٍ هَالِكٌ اِلَّا وَجْهَهٗ) "اس کا بادلوں کے سائے میں آنا" (اَنْ یَّاْتِیَهُمُ اللّٰهُ فِیْ ظُلَلٍ مِّنَ الْغَمَامِ) وغیرہ کو بھی لغوی معنوں میں لینا پڑے گا۔ (تَعٰلَى اللّٰهُ عَمَّا یَصِفُوْنَ)۔

(۲)

اس سلسلے کے دوسرے مضمون میں میرے بزرگ اور محترم رفیق جناب نعیم صدیقی صاحب نے ایک نحوی گرفت کی ہے۔ اُن کا کہنا ہے کہ اِلّا (حرفِ استثنا) سے یہ مطلب نہیں ہوتا کہ پہلے تو بیان کردہ نوع یا گروہ کے تمام افراد خسارے سے دوچار ہو جائیں گے اور اس میں نیک و بد کی کوئی تمیز نہ ہوگی۔ بعد میں اِلّا کے اقتضا کے تحت ایک جُز کو خسران سے نکال کر فلاح و نجاح سے سرفراز کر دیا جائے گا۔ بلکہ عربی زبان میں "اِلّا" مجموعی حکم کی زد میں آنے والی صف سے مستثنیٰ افراد کو پہلے ہی الگ نکال دیتا ہے" اور اس کی تائید میں موصوف نے کئی آیات پیش کی ہیں۔

اپنے موقف کی تائید میں میں بھی ایک اقتباس پیش کرنے کی جسارت کرتا ہوں۔ سورۂ مدثر میں فرمایا گیا ہے۔ كُلُّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ رَهِينَةٌ ۝ إِلَّا أَصْحَابَ الْيَمِينِ ۝ فِي جَنَّاتٍ ..... الخ (ہر نفس اپنے کسب کے بدلے رہن ہے، سوائے دائیں ہاتھ والوں کے، جو جنتوں میں ہوں گے) اگر نعیم صاحب کا اصول اس اقتباس پر بھی لاگو کیا جائے تو مطلب یہ ہوگا کہ دائیں ہاتھ والے اپنے کسبِ اعمال سے پہلے ہی جنتوں میں پہنچا دیئے جائیں گے اور ظاہر ہے کہ بات قطعاً غلط ہے۔ دُنیا میں اپنے اعمال درست رکھنے والے ہی اپنے اعمالِ صالحہ کی بدولت (نیز عقائدِ صحیح کے ساتھ ساتھ) جنت پانے کے حقدار ٹھہرائے جائیں گے۔ اسی لیے دُنیا کا یہ دارالامتحان تیار کیا گیا ہے، اور انسان کو اس میں مہلتِ عمل دی گئی ہے۔ گویا فی الواقع ہر نفس اپنے کسب کے بدلے رہن ہے۔ البتہ ان میں سے جو نیک اعمال کی بدولت اپنا نفس رہن سے چھڑا لیں گے وہی اصحاب الیمین ٹھہریں گے۔ پس نتیجہ یہ نکلا کہ "اِلّا" کا استثنا ہمیشہ اسی طرح نہیں ہوتا جس طرح محترم نعیم صاحب کی پیش کردہ مثالوں میں آیا ہے۔ اسی لیے عربی قواعد میں بھی استثنا کی دو حالتیں بیان کی گئی ہیں۔ متصل اور منقطع۔ اوّل الذکر کی مثال وہ ہے جو میں نے پیش کی، اور جس کی مثال میرے نزدیک "العصر" کا استثنا بھی ہے، اور ثانی الذکر میں نعیم صاحب کی پیش کردہ مثالیں آجاتی ہیں۔

نعیم صاحب نے اس کے علاوہ جتنی بھی آیات سے اپنے موقف کو مزید تقویت دی ہے، میں

ان میں سے کسی کا بھی انکار نہیں کرتا اور نہ کر سکتا ہوں - بات تو صرف غیر مسلم کو سمجھانے کی تھی - اور وہ العصر کی اس گواہی سے تو ہرگز انکار نہیں کر سکتا کہ انسان مسلسل خسارے میں زندگی گزارتا ہے، البتہ اہلِ ایمان کو مستثنیٰ کرنے کی گواہی بھی زمانہ ہی دے رہا ہے ؟ — یہ بات اگر صحیح ہوتی تو جیسا کہ میں اوپر عرض کر چکا ہوں، کوئی کافر بھی ایمان لانے سے باز نہ رہتا - اور پھر اب تو وہ بات ہی ختم ہو گئی ہے، کیونکہ میں نے "موت" کے بجائے خود گذرتے ہوئے زمانے کو انسان کا خسارہ تسلیم کر لیا ہے ، لہٰذا اس موضوع پر مزید قلم فرسائی کی حاجت نہیں رہی -

---

محترم پروفیسر آسی ضیائی صاحب نے مستفسرانہ انداز میں جو بحث چھیڑی تھی، اس کے سلسلے میں دو تین تحریریں شائع ہو چکی ہیں - اب ان کی آخری تحریر کے ساتھ اس بحث کو ختم کیا جاتا ہے - (ادارہ)

حدود اللہ (بلحاظ موضوعات)

ایک ایسی کتاب جس میں قرآن کریم کے مضامین کو ان کے عنوانات کے تحت (اردو میں) یکجا کر دیا گیا ہے تاکہ قاری کو جو بھی مسئلہ دریافت طلب ہو بہ آسانی چند لمحوں میں معلوم کر سکے -

مجلد، صفحات : ۳۲۰ - ھدیہ ۲۸/- روپے - کتب فروش بھی رجوع فرمائیں

عالمگیر پبلشرز - تاج مینشن - 8/3 کمرشل ایریا - ناظم آباد ۲ کراچی